© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح افراد کے مابین تعاون اور باہمی امداد زندگی کے معمولات ہیں، بالکل اسی طرح قومیں بھی بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی معاونت کرتی رہتی ہیں۔ آپس کا لین دین اور تعاون اجتماعی زندگی کا ایک خاصہ ہے۔ غیر ملکی امداد کا حصول کوئی ایسا خصوصی امتیاز نہیں جو صرف پاکستان کو حاصل ہوا ہو اور نہ یہ کوئی ایسی غیر معمولی سعادت ہے جس سے صرف اہلِ پاکستان ہی بہرہ مند کیے گئے ہوں۔

ایک باغیرت اور خوددار فرد بھی بعض اوقات دوسرے افراد سے امداد حاصل کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور وہ امداد دینے والے حضرات کا شکر گزار بھی ہوتا ہے، لیکن اس معاونت کے عوض کبھی اپنے ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت اور اپنی خودداری کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی حال دنیا کی خوددار قوموں کا ہے۔ وہ اپنے بعض معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے دوست قوموں سے امداد طلب کرتی ہیں، اور اس مدد کے لیے وہ اُن کی ممنونِ احسان بھی ہوتی ہیں لیکن انہوں نے ایک ثانیہ کے لیے بھی کبھی اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ جذبۂ سپاس گزاری کے زیر اثر اپنی قومی حمیت، قومی غیرت اور قومی احساسات ہی کو محسن قوم کے استھان پر بھینٹ چڑھا دیں۔

احسان کا اعتراف انسانی زندگی کی بلا شبہ ایک قابلِ قدر خوبی ہے لیکن اس اعتراف کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوئی فرد یا قوم اپنے افکار و نظریات اور اپنی اُن اخلاقی اقدار کو تیاگ دے جن کی وجہ سے کسی شخص کی انفرادیت یا کسی قوم کا قومی تشخص قائم ہوتا ہے۔ محسن کے کسی احسان کے اعتراف کی آبرو مندانہ صورت یہ ہے کہ ہمیشہ اُس کی بھلائی اور خیر خواہی کا خیال رکھا جائے اور مصیبت میں اُس کی حتی الامکان دستگیری کی جائے۔ دُنیا میں احسانات کا بدلہ چکانے کی یہی ایک معقول صورت ہے۔ غیرت مند افراد اور خوددار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوموں نے کسی فرد یا قوم کے احسان کے مقابلے میں ہمیشہ یہی روش اختیار کی ہے۔

تاریخ کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قوم جو کسی دور میں خودداری، خود اعتمادی اور وقار کا پیکر خیال کی جاتی تھی، جسے اپنے معتقدات اور اپنے اخلاقی معیارات دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھے، وہ اب تھوڑی سی فوجی اور مالی امداد کے عوض اپنی متاعِ ایمان کو رہن رکھنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ آخر دنیا کی دوسری قومیں بھی بوقتِ ضرورت ایک دوسری سے اس نوعیت کی امداد لیتی رہتی ہیں، لیکن کیا ان میں سے کسی ایک قوم نے بھی اس امداد کے بدلے میں فکر کا کوئی ایسا انداز اور عمل کی کوئی ایسی روش اختیار کرنا گوارا کیا ہے جس سے اُن کا الگ قومی وجود ہی برباد ہو کر رہ جاتے؟ یہ بے حمیتی صرف مسلمان ممالک ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ جس قوم سے بھی فوجی یا معاشی امداد حاصل کرتے ہیں اس کے ساتھ اُس کے افکار و نظریات اور اُس کی اخلاقی اقدار کو بھی اپنے ہاں راہ پانے کے پورے مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔ انڈونیشیا، مصر، شام، الجزائر اور بعض دوسرے ملکوں میں اس روش کے بدترین نتائج ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ اور اب ہم بڑی تشویش کے ساتھ پاکستان کو اس انجام کی طرف بڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بھی ایک مدت سے یہ بات گویا ایک قاعدے کے طور پر طے ہو گئی ہے کہ جو قوم بھی ہمیں تھوڑا سا اسلحہ یا ترقیات کے لیے کچھ ساز و سامان فراہم کر دے، ہم اُس کے ان احسانات کے اعتراف میں اس کی امداد کے ساتھ ساتھ اُس کے افکار و نظریات کا بھی بڑی عقیدت کے ساتھ استقبال کریں اور اس کو یہ مواقع بہم پہنچائیں کہ وہ اس امداد کے عوض یہاں جو فکری اور علمی گمراہیاں پھیلانا چاہے آزادی سے پھیلائے۔ آغاز میں امریکہ نے اپنے بعض سامراجی مفادات کے پیشِ نظر ہمیں کچھ مالی اور فوجی امداد بہم پہنچائی تو ہم اُس کے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ اپنی قومی خودداری اور قومی غیرت کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ اُس نے دنیا کی بساطِ سیاست پر ہمیں بطور مہرہ چلایا اور بسا اوقات ہمیں ایسی روش اختیار کرنے پر مجبور کیا جس سے ہمیں ملّی نقطۂ نظر سے شدید نقصان پہنچا۔ پھر ہم نے اُس کے اس احسان کے بدلے اپنی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو بھی بدلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور اس ملک کو امریکی فکر و عمل کا نمونہ بنانے کے خواب دیکھنے لگے۔ امریکہ کی بے وفائی کے بعد ہمیں چین کا سہارا ملا تو اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ چین کے لیے ہمارے دلوں میں صرف جذبۂ سپاس گزاری ہی موجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہے بلکہ ہر طرف چین کے قصیدے پڑھے جا رہے ہیں، اس کے نظام کو نمونہ اور مثال بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اس کے لیڈر کو اپنا قومی ہیرو بنایا جا رہا ہے، اور اشتراکی لٹریچر کا ایک سیلاب ہے جو پورے ملک میں ایک طوفان کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

اہلِ پاکستان کا یہ غلامانہ طرزِ عمل کس بات کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں؟ اس سوال پر ہمارے ملک کے ہر حساس شہری کو غور کرنا چاہیے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل اِس افسوسناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم اب ایک ایسی قوم بن گئے ہیں جو ذہنی اعتبار سے مفلس اور اخلاقی اعتبار سے بالکل قلاش ہے۔ ہمارے پاس نہ تو فکر و نظر کا کوئی سرمایہ رہ گیا ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہوں اور نہ سیرت و کردار کا کوئی مضبوط ڈھانچہ رہ گیا ہے جس کے بل پر ہم کھڑے رہ سکتے ہوں۔ ہم اس وقت فکری اور اخلاقی اعتبار سے بالکل خلا میں جی رہے ہیں اور ہر وقت اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی طاقتور قوم آتے اور اس خلا کو اپنے تصورات اور اپنے اخلاقی معیارات سے پُر کر دے۔ کیونکہ ہم اپنی جگہ بالکل تہی دست اور تہی دامن ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی قوم کے احساس کمتری یا دوسرے لفظوں میں اس کے ہلکے پن کو ظاہر کرتی ہے۔ جس طرح کسی ایک مقام کی ہوا ہلکی ہو کر اوپر کو اٹھتی ہے اور اردگرد کی بھاری ہوا کے لیے خود بخود جگہ خالی کر دیتی ہے جو تند و تیز طوفان کی صورت میں اس کی طرف یورش کرتی ہے، بالکل اسی طرح جب کسی قوم کا اپنے افکار و نظریات اور اپنے نظام اخلاق پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ انہیں بے وزن خیال کر کے انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیتی ہے تو اُس کے دل و دماغ میں خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنے کے لیے باہر کے معتقدات اور باہر کے اخلاقی نظریات بپھری ہوئی موجوں کی طرح اُس کی طرف لپکتے اور خلا کو پُر کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ ہوائیں اگر فطری رفتار سے ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف چلتی رہیں تو وہ کسی تباہی کی باعث نہیں بنتیں لیکن جب خلا انہیں یورش کی دعوت دیتا ہے تو وہ شدید تھپیڑوں کی صورت میں اس مقام پر حملہ آور ہوتی ہیں اور خلا کو پُر کرنے کے بجائے طوفان اٹھا دیتی ہیں۔ یہی حال قوموں کے فکری اور اخلاقی خلا کا ہے۔ یوں تو دنیا میں قوموں کے مابین افکار و نظریات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبادلے ہوتے ہی رہتے ہیں اور قومیں اپنے مزاج اور ضرورت کے تحت ایک دوسرے کے تصورات سے متاثر بھی ہوتی ہیں لیکن جب خلا کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر یہ تصورات دھیمی رفتار سے آکر خلا کو پُر نہیں کرتے بلکہ اُس قوم کے ذہنی افق اور اُس کے اخلاقی پس منظر پر ہلاکت خیز یورشیں برپا کرتے ہیں اور قومیں نئے افکار اور نئے ولولوں کے ساتھ کسی تعمیرِ نَو میں منہمک ہونے کے بجائے شدید فکری اور اخلاقی انتشار کی شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پاکستان کے حالات کا جب ہم اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ اصول یہاں سو فیصد درست دکھائی دیتا ہے۔ ہم غیر ملکی افکار یا غیر ملکی تجربات کی کوئی اچھی چیز دیکھ کر اُن سے جائز حد تک فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے بلکہ ہمارا طرزِ عمل تو اس بھکاری کا سا ہے جو کشکولِ گدائی لیے ہوئے مختلف قوموں کے سامنے مارا مارا پھرتا ہے اور جہاں سے بھی کوئی چیز مل جائے اُسے بڑھ کر قبول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اس کشکول میں مختلف نظریات کے بچے کھچے ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ملک میں دوسرے ممالک کے ساتھ ثقافتی دوستی کے لیے جو متعدد انجمنیں قائم ہیں اُن کے ناموں اور اُن کے کارناموں پر اگر نگاہ ڈالیں تو آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ یہ ایک ایسا ملک ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل ایک ویرانہ ہے اور اس چٹیل میدان میں جو ادارہ یا شخص افکار و نظریات کے جو بیج چاہے بو دے کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔

کچھ مدت تک تو یہاں امریکہ کے الحاد اُس کی مادی تہذیب اور اس کی اخلاقی اباحیت کا چرچا ہوتا رہا۔ ہم نے اس وقت بھی ایک بار نہیں، متعدد بار اس کے زہریلے اثرات سے قوم کو آگاہ کیا۔ لیکن امریکہ کی محبت ہمارے ملک کے برسرِ اقتدار طبقوں کے دلوں میں اس حد تک جاگزیں تھی کہ انہوں نے ہماری ایک نہ سنی بلکہ اُلٹا ہمیں موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ اب وہ دَور گزر رہا تھا کہ یہ خطۂ پاک اشتراکی چین کے خیالات اور افکار کی زد میں آگیا۔ کوئی شک نہیں کہ چین نے بڑے نازک وقت میں بھارت کے مقابلے پر ہماری مدد کی ہے

© rasailojaraid.com

ہم اُس کی اس معاونت کے لیے اُس کے شکر گزار ہیں۔ اُس نے ہماری بعض مالی دشواریوں میں بھی کچھ نہ کچھ ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ اُس کے اس تعاون کی بھی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ لیکن آخر یہ کس نوعیت کا جذبہ سپاس گزاری ہے کہ ہم اس کے افکار و نظریات اور اُس کے اخلاقی فلسفے کو بھی اپنانا شروع کر دیں۔ عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر چین کو کل ہماری امداد کی ضرورت پیش آئے تو ہم بھی بڑے خلوص کے ساتھ اُس کی طرف اپنا دستِ تعاون بڑھائیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے اُس کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ اس کی خیر سگالی کا ایک ہی جائز بدلہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بھی اُس کی خیر خواہی کریں۔ لیکن یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ہم اُس کی اس امداد کے بدلے اس بات کو گوارا کر لیں کہ وہ یہاں آزادی کے ساتھ جن افکار و تصورات کو پھیلانا چاہے، پھیلاتا رہے؟ غیرت مند قومیں مالی امداد کے عوض اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کو نہیں بیچا کرتیں۔ یہ دراصل احسان مندی نہیں بلکہ غیرت و حمیت اور قومی خودداری کا فقدان ہے جس کی بدولت چینی اشتراکیت کی اشاعت کے لیے یہاں سارے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے ہیں۔ خصوصاً یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یہ لٹریچر اتنی تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے کہ سطح بین آنکھیں اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ مشرقی پاکستان میں اس کی اشاعت کا دائرہ مغربی پاکستان سے بھی زیادہ وسیع اور اس کی رفتار غیر معمولی حد تک تیز ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ڈھاکہ یونیورسٹی کو ماؤ کی سرخ کتاب کے کئی ہزار نسخے بطور تحفہ دیئے گئے اور وہ شکریہ کے ساتھ قبول کر کے نوجوانوں میں پھیلا دیئے گئے۔ پی آئی اے کے جہازوں میں یہ لٹریچر مسافروں کی تواضع کے لیے کثرت سے پیش کیا جاتا ہے۔ بعض مواقع پر تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ آدمی پاکستان میں نہیں بلکہ شاید اشتراکی چین میں سفر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ماؤ کی تصویر کے بیج کثرت کے ساتھ نوجوانوں اور خاص طور پر طلبا کے سینوں پر آویزاں کیے جا رہے ہیں گویا کہ اب یہ اُن کا قومی ہیرو ہے اور اسی کی عقیدت اور محبت ان کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ بعض سرپھروں نے تو باہر کی چند شخصیتوں کے نام پر اپنے بچوں کے نام بھی رکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ پھر جو شخص بھی چین یاترا میں وہاں کے حالات کا بالکل سرسری سا اور زیادہ تر سرکاری نگرانی میں کیا ہوا مشاہدہ کر کے واپس لوٹتا ہے وہ اس ملک کی مدح و ستائش میں اتنے مبالغہ آمیز بیانات دیتا ہے کہ آدمی کو اس ملک پر طلسم ہوشربا کا گمان ہونے لگتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ لوگ وہاں کی مادی ترقی کے افسانے تو بیان کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ سُرخ انقلاب کس قیمت پر آیا ہے اور اس کی آمد کے ساتھ انسانیت اور انسانی اقدار کا کیا حشر ہوا ہے اور اس کی لائی ہوئی ترقیات نے انسان سے لیا کیا ہے اور اسے دیا کیا ہے۔ چین کے عشق میں سرشار سیاحوں کو اتنا ہوش ہی کہاں ہے کہ وہ کبھی یہ باتیں بھی سوچیں۔

ہماری اس نیازمندی و خود رفتگی کے جواب میں اگر چین کی طرف سے کچھ ہوا ہے تو بس اسی قدر کہ ہمارے صدر مملکت کے دورہ کے موقع پر اہلِ چین نے ان کا کئی میل لمبا جلوس نکالا اور ان کے اعزاز میں بہت سی ضیافتیں دیں۔ اس سے آگے بڑھ کر کیا کوئی شخص ایک مثال بھی اس امر کی پیش کر سکتا ہے کہ کسی چینی نے پاکستان سے واپس جا کر اس ملک کی مدح و ثنا میں کوئی قصیدہ پڑھا ہو؟ کیا اہلِ چین یہ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ پاکستان کی طرف سے اُن کے ملک میں اسلامی نظریات کی اشاعت کی جائے؟ یا کوئی چینی پاکستان سے اسلامی لٹریچر کو وہاں درآمد کر کے پھیلائے؟ یا وہاں کا کوئی پریس اسلامی لٹریچر چھاپے اور اس کی اشاعت کرے؟ یا وہاں کے طلبہ اور عوام کے سینوں پر ماؤ کے بجائے یا اس کے ساتھ پاکستان کی کسی شخصیت کے نام یا تصویر کے بیج آویزاں کیے جائیں اور اسے چینی قوم کا ہیرو بنانے کی کوشش کی جائے؟ ان باتوں پر عمل تو درکنار، ان کی محض تجویز، بلکہ اِن کا تصور و خیال ہی اشتراکی چین کے سامنے پیش کیا جائے تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ پاکستان کے لیے ان لوگوں کے دل میں کتنی قدر و منزلت اور کتنی رواداری اور کتنی مخلصانہ وابستگی موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے معاملے میں چین کے اس رویّہ کی وجہ کیا ہے؟ کیا فی الواقع اس کی وجہ یہی ہے کہ افکار، نظریات، تہذیب، اخلاق اور اکابر انسانیت کے لحاظ سے ہم قطعی مفلس و بے مایہ ہیں جس کی وجہ سے چین کو ہم سے کوئی چیز لینے کی کوئی حاجت نہیں ہے؟ اور کیا ہم بھی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے ہیں اور ہماری نگاہ میں چین ان سارے پہلوؤں سے مالا مال ہے جس کی وجہ سے ہم بھک منگے اس سے فوجی اور مادّی امداد ہی نہیں، اَقدار بھی اور ہیرو بھی اسی سے مانگ لانے کے محتاج ہیں؟ یہ سوال ایسا ہے جو ہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستانی کو اپنے ضمیر سے بھی پوچھنا چاہیے اور اپنے ملک کے چین پرستوں اور ماؤ پرستوں سے بھی اس کا جواب مانگنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ چین پاکستان کے ساتھ اپنی دوستی کو صرف مادّی تعاون تک اور بین الاقوامی معاملات میں صرف دوستانہ سیاسی تعلقات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے کسی نظریۂ حیات یا کسی اخلاقی معیار کو اپنانے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں اور نہ اس ملک کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی عقیدت اور ذہنی غلامی اختیار کرنے پر آمادہ ہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم بھی اس قوم کی رفاقت کو صرف ان معاملات تک ہی محدود نہیں رکھتے؟ آخر ہم چین کے دستِ تعاون کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر اس واضح حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی اسلام کی شکل میں ایک مستقل ضابطۂ حیات موجود ہے جس کی موجودگی ہمیں تمام دوسرے ضابطوں سے بے نیاز کر دیتی ہے؟ ہمارا اپنا ایک فلسفۂ زندگی ہے جو دوسرے تمام فلسفوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہماری اپنی ایک تاریخ ہے جس کے ابواب دنیا کی ساری اقوام کے کارناموں سے کہیں زیادہ روشن اور تابندہ ہیں۔ ہمارے پاس اپنے ہیرو ہیں جن کے درجے اور مرتبے کے ہیرو دنیا کی کسی قوم کو میسّر نہیں ہیں۔ اس عظیم ملّی سرمائے کی قدر ہمارے دل میں ہوتی تو ہمارا سر فخر سے اونچا ہوتا نہ کہ ہمارا ہاتھ ہر ایک کے آگے بھیک مانگنے کے لیے پھیلتا۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہوئے بغیر ہم ایک ایسے نظریۂ زندگی کو کس طرح اپنا سکتے ہیں جو بنیاد سے لے کر جزئیات تک ہمارے پورے تصورِ حیات سے متصادم ہو۔ کوئی قوم اگر وقتی مصالح، سیاسی حالات یا بین الاقوامی مشکلات کے دباؤ سے ہماری دوستی کی ضرورت محسوس کرے اور ہماری امداد پر آمادہ ہو جائے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اُسے فکر و عمل میں سراپا خیر سمجھ کر اُس کی تقلید کرنے لگیں۔ ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم نظامِ حیات کے معاملے میں کوئی ایسی تہی دامن قوم نہیں ہیں کہ ہمارے دامن میں جو کچھ ڈال دیا جائے ہم اُسے بڑھ کر سینے سے لگا لیں۔ ہم بھی اپنے پاس افکار و اعمال کا ایک بیش قیمت سرمایہ رکھتے ہیں اس بنا پر کسی دوسری قوم کے نظریات اپنانے سے پہلے ہمیں اس بات کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے کہ ہم باہر سے جن تصورات یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن اقدار کو اخذ کر رہے ہیں وہ ہمارے اس سرمائے کے لیے تو نقصان دہ ثابت نہیں ہونگی۔

اس نقطۂ نظر سے ہم جب صورتِ حال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے بڑے تلخ حقائق آتے ہیں۔

ان صفحات میں ہم اپنی قوم کے سنجیدہ طبقوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا چین کی اشتراکیت محض غربت اور افلاس دُور کرنے کی ایک مؤثر تدبیر ہے؟ اگر اس کی حیثیت صرف تدبیر کی سی ہوتی تو اس کی افادیت پر غور کر کے اس کے بعض اچھے اجزاء سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ لیکن ماؤ کی جو تصریحات وقتاً فوقتاً سامنے آتی ہیں اُن کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ چینی اشتراکیت بھی مارکسی اشتراکیت کی طرح ایک مکمل نظامِ حیات ہے محض کچھ معاشی مسائل کے حل کی ایک تدبیر نہیں ہے۔ یہ پورا نظام دراصل ایک اساسی تصور کی عملی تعبیر ہے جس کے ہر شعبے بلکہ ہر ریشے میں مادی فلسفہ پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ مافوق الطبیعی نظریات سے لے کر زندگی کے معمولی سے معمولی جزئیات تک ہر چیز مادی نظریۂ حیات کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ اس حقیقت کا واضح اعتراف ماؤ نے خود اپنی متعدد تحریروں میں کیا ہے۔ اپنی لال کتاب یعنی "تعلیمات ماؤزے تنگ" میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ کمیونزم پرولتاری نظریے کا ایک مکمل نظام اور ایک نیا اجتماعی نظام ہے۔ یہ ہر کسی دوسرے نظریاتی اور اجتماعی نظام سے جدا ہے اور انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ جامع، ترقی پسند، انقلابی اور اعتدال پسند نظام ہے۔" (ص ۲۷)

عقل باور نہیں کر سکتی کہ دنیا کی کوئی قوم اس قدر ہمہ گیر نظام کی علمبردار بن کر اٹھے اور پھر وہ اپنے ہاں کسی ایسے فکری و اعتقادی اور معاشرتی نظام کو گوارا کرے جو اس سے بالکل مختلف ہو۔ اس نوعیت کے کسی انقلاب انگیز اور ہمہ گیر نظام کا قیام کسی دوسرے نظام کے ملبے پر ہی ممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اشتراکی نظام کچھ مدت تک بعض مصالح کے تحت اسلام سمیت تمام مذاہب و ادیان سے براہِ راست تعرض نہ کرے لیکن اس کے بقا، اس کی توسیع و ترقی اور اس کی مکمل علمبرداری کے لیے یہ چیز اشد ضروری ہے کہ جس مقام پر بھی وہ پھیلنا چاہتا ہو وہاں ہر دوسرے موجود اور مدمقابل نظام کو فنا کر دے۔ اشتراکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہنماؤں نے اپنی ایک تحریر میں اسے صاف طور پر بیان کیا ہے:

"یہ عین ممکن ہے کہ سامراج اور جاگیرداری کو شکست دینے کے لیے ہمیں تصورات کے بعض شیدائیوں اور مذہب سے وابستگی رکھنے والوں سے وقتی طور پر اتحاد کرنا پڑے لیکن ہم اُن کے تصورات اور اُن کے مذہبی عقائد سے قطعاً اتفاق نہیں کر سکتے۔"

"اشتراکیوں کو اس بات کا پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ جُوں جُوں اس انقلاب کے اثرات وسیع ہونگے اسی نسبت سے مذہب کا خاتمہ ہوگا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ رفتار سُست ہو لیکن مذہب کی موت یقینی امر ہے[1]۔"

اشتراکی چین نے مسلمانوں اور ان کے مذہب کے ساتھ یہی معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اُس کے وہی نتائج برآمد ہوئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

چین میں اس وقت جو مسلمان آباد ہیں ان کی کثیر تعداد اُن عرب، ترک اور ایرانی تاجروں کی اولاد پر مشتمل ہے جو ساتویں صدی اور چودھویں صدی کے درمیان اس ملک میں آباد ہوئے۔ ان لوگوں نے زیادہ تر ہنز (HANS) کے قبیلے میں شادیاں کیں۔ اسی بنا پر یہ قبیلہ اسلام کا علمبردار اور اس کی مقدس روایات کا امین خیال کیا جاتا ہے۔ آج سے تیس برس پیشتر ۱۹۳۸ء کی مردم شماری کے مطابق چین میں مسلمانوں کی تعداد قریب قریب پانچ کروڑ اور اُن کی مساجد کی تعداد ۴۲۳۲۱ تھی۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب اشتراکی حکومت نے آبادی کا جائزہ شائع کیا تو اس میں چینی مسلمانوں کی تعداد صرف ایک کروڑ اور مساجد کی تعداد ....۴ رہ گئی۔ یہ چار کروڑ مسلمان آخر کہاں گئے؟ کیا انہیں آسمان نے اُچک لیا یا زمین انہیں نگل گئی؟ اگر ۱۹۳۸ء میں ان کی تعداد ۵ کروڑ تھی تو ۱۹۵۲ء میں انہیں کم از کم سات کروڑ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ تعداد بڑھنے کے بجائے حیرت انگیز حد تک کم ہو گئی ہے۔ یہ صورتِ حال ہر مسلمان

---

[1] YU HSIANG AND LIU CHUNG-WANG, THE CORRECT RECOGNITION AND HANDLING OF RELIGION.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ وہ اشتراکیت کے طرزِ عمل پر غور کرے۔

چین کے مسلمان نہ صرف ذہین اور قابلِ اعتماد تاجر ہیں بلکہ بڑے نڈر سپاہی بھی ہیں۔ان حقائق کے پیشِ نظر ماؤ نے اوّل اوّل مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی۔اس کے اس طرزِ عمل کے پیچھے دو مقاصد کارفرما تھے۔ایک یہ کہ مشرق میں اشتراکی چین کے توسیعی عزائم کے لیے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا نہایت ضروری تھا۔دوسرے ہنز جیسی جنگجو نسل کی خدمات کے بغیر ملک کے اندر کوئی مضبوط اشتراکی حکومت قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔اس بنا پر آغاز میں ماؤ نے مسلمانوں کے جذبات کی کسی حد تک پاسداری کی اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اشتراکی انقلاب اُن کے مذہبی عقائد پر قطعاً اثر انداز نہ ہوگا بلکہ انہیں اپنے مذہبی احکام بجا لانے کی پوری آزادی ہوگی۔مسلمانوں نے ماؤ کے ان دلفریب وعدوں پر اعتماد کر کے اُس کے لیے ہر قسم کا ایثار کیا۔اشتراکی انقلاب کے لیے جو فوج تیار کی گئی اس میں کئی ایک رجمنٹیں پوری کی پوری مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔

لیکن چونکہ اشتراکیت کے علمبرداروں کی نیت درست نہ تھی اس لیے انہوں نے شروع ہی سے بڑی عیاری کے ساتھ ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جو مسلمانوں کے لیے دینی نقطۂ نظر سے بڑا مہلک اور تباہ کن تھا۔اشتراکیت کے ان شیدائیوں کی گہری چالبازیوں کا اندازہ اس ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے۔۱۹۳۶ء میں ماؤ نے شمال مغرب میں رہنے والی مسلم آبادی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں اس خطے میں ایک با اختیار مسلم حکومت کے قائم کرنے میں مدد دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اُس کے تمدن کی حفاظت کا بھی التزام کرے گا۔لیکن ۱۹۵۸ء میں جب اس وعدہ کی تکمیل کا وقت آیا تو ماؤ نے اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کو حکومت خود اختیاری قائم کرنے کی اجازت نہ دی بلکہ انہیں نسلی امتیاز کی بنیاد پر منظم کیا۔اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دینِ حق سے برگشتہ کرنے کے باقاعدہ منصوبے بنائے گئے۔مکاتب اور مسجدیں اشتراکیت کی غیر اسلامی سرگرمیوں کا ہدف سب سے پہلے بنیں اور دین کے ان مقدس مراکز کو یا تو بند کر دیا گیا یا انہیں تھیٹر اور لائبریریوں میں تبدیل کر دیا گیا۔پھر مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو یہ حکم ملا کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی ایسی تاویلات کریں کہ اشتراکیت اور اسلام ایک دوسرے سے بکسر ہم آہنگ ہو جائیں اور ان میں کوئی بُعد و بیگانگی باقی نہ رہے اور مسلمان کسی مرحلہ پر بھی یہ محسوس نہ کریں کہ وہ اشتراکیت کی پیروی میں اسلام کے کسی اصول کو توڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت کا نقش بٹھانے اور اس کی محبت جاگزیں کرنے کے بجائے انہیں اشتراکیت کا علمبردار بلکہ پرستار بنانے پر زور دیا جانے لگا۔ چنانچہ مسلم اکثریت کے ایک صوبے کی انقلابی کمیٹی نے یہ طے کیا:

"اس صوبے کی حکومت، جماعت اور اس کے مالی وسائل اور ثقافتی اور تہذیبی قوتیں سب اس اشتراکی کمیٹی کے ہاتھ میں مرتکز ہیں۔ ہر فرد کو اپنا سارا زور اس انقلاب کو مستحکم کرنے اور پیداوار بڑھانے پر صرف کرنا چاہیے۔ پھر ہم میں سے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم انقلاب دشمن طاقتوں کو بڑی سختی کے ساتھ دبائیں اور ماؤزے تنگ کی تعلیمات کے مطالعہ اور ان سے عملی فائدہ اٹھانے کے لیے نئے نئے معیار قائم کریں۔"[1]

ماؤ اور اس کے ساتھیوں کا اسلام کے بارے میں یہ طرزِ عمل اور اپنے کیے ہوئے وعدوں کی یہ بے حرمتی کوئی ایسی باتیں نہیں جنہیں عقل ماننے پر آمادہ نہ ہو سکتی ہو۔ اشتراکیت کے یہ سارے کارنامے اُس کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اپنے وعدوں کا انہیں اس لیے کوئی پاس نہیں کہ جس فلسفے پر وہ ایمان رکھتے ہیں اُس کی رو سے کوئی فعل بھی اخلاقی اعتبار سے اپنی کوئی مستقل قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اُن کے نزدیک ہر وہ کام جائز ہے جس سے اشتراکیت کی راہ ہموار ہو سکتی ہو۔ اگر مسلمانوں سے خوش کُن وعدے کر کے انہیں بڑی کامیابی سے اس نظام کا آلۂ کار بنایا جا سکتا ہو تو وعدے کرنے میں قطعاً کسی تامل سے کام نہ لینا چاہیے۔ البتہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کی تکمیل بھی کی جائے۔ اگر انہیں پورا کرنے سے اشتراکی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو انہیں بڑی بے تکلفی سے رد کر دینا چاہیے کیونکہ اصل چیز تو مقصد کا حصول ہے۔ ہر وہ ذریعہ درست اور جائز ہے جو مقصد کے لیے مفید اور کارآمد ہو اور ہر وہ بات غلط اور ناجائز ہے جس سے مقصد کو نقصان پہنچتا ہو۔

---

[1] پیکنگ ریویو، جلد ۹، شمارہ ۴۴۔ ص ۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بنا پر اگر آغاز میں مسلمانوں کو اشتراکیت کا ہمنوا بنانے کے لیے اُن سے مذہبی تحفظات کے کچھ وعدے کیے گئے تھے تو اُن کی حیثیت محض ایک تدبیر کی تھی۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اُن کی تکمیل بھی کی جائے۔ اُن سے وقتی طور پر جو کام لینا مقصود تھا وہ لیا جا چکا ہے اور اب اُن کے لیے معقول اور سیدھی راہ یہی ہے کہ وہ اسلام کو تیاگ کر پوری یکسوئی کے ساتھ اشتراکیت کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لیں۔ ماؤ اور اُس کے ساتھیوں نے کچھ مدت تک تو بالواسطہ اور چھپے ہوئے طریقوں سے اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن تازہ ثقافتی انقلاب (CULTURAL REVOLUTION) کے بعد جب اُس نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیا تو مسلمانوں سے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ اسلام کو چین کے اشتراکی نظام میں زندہ رہنے کا قطعاً حق نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کی تعلیمات ماوزے تنگ کے فلسفۂ انقلاب سے متصادم ہیں۔ اس نوعیت کی ایک تنبیہ دسمبر ۱۹۶۷ء کے ترجمان القرآن میں ہم نقل کر چکے ہیں۔

ماؤ نے اپنی تصنیفات میں مختلف زاویوں سے اس موضوع پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکی تحریک کو اتنا مضبوط، اس کے اثرات کو اتنا ہمہ گیر اور اس کے نظم کو اتنا سخت بنا دیا جائے کہ قومی اقلیتیں (NATIONAL MINORITIES) خود بخود اس میں تحلیل ہو کر رہ جائیں، یا اگر زندہ بھی رہیں تو اُن کا قطعاً کوئی وزن باقی نہ رہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اقلیت اتنی سخت جان ہو کہ وہ ان سارے صدمات کو سہہ کر بھی زندہ رہنے کی جد و جہد کرے تو پھر اسے مٹا دیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا۔ اشتراکیت کے تند و تیز دھارے نے اُنہیں اس شدت کے ساتھ اپنی لپیٹ میں لیا کہ پانچ کروڑ کی مضبوط اقلیت کا ۱/۲ حصہ خود چین کے سرکاری اعداد و شمار کی رُو سے اشتراکیت کے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ باقی ماندہ جن مسلمانوں نے مذہب کی بنیاد پر اپنے تحفظ کی کوشش کی اور مسجدوں کے ساتھ وابستہ رہنا چاہا اور اکل و شرب اور نکاح و طلاق کے معاملے میں حلال و حرام کے درمیان امتیاز پر اصرار کیا، انہیں بزورِ قوت دبا دیا گیا۔ ان بچے کھچے افراد کے مذہبی احساسات کو مردہ کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ فیکٹریوں اور کارخانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کام کرنے والے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ دوپہر کے وقت وہی کھانا کھائیں جو غیر مسلموں کو کھانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ ان کی عورتوں کو گھروں سے نکال کر اجتماعی زندگی کے مختلف مراکز میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا گیا۔ پھر نہ صرف اُن کے چہروں سے نقاب نوچے گئے بلکہ انہیں تمام ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر شریک کیا جانے لگا۔ عمل کے یہ مختلف محور بدلنے کے ساتھ اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا گیا کہ مسلمانوں کے فکر و نگاہ کے زاویے بھی یکسر بدل کر رکھ دیئے جائیں۔ انقلاب کے آغاز میں تو ساری کوشش اس بات پہ صرف کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ ماؤ کی اشتراکی تعلیمات درحقیقت اسلامی تعلیمات ہی ہیں، اِن دونوں کے مابین کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور چین کا یہ عظیم رہنما جو کچھ کر رہا ہے وہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے اصول و مبادی کو ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ کر کے دکھانے کے لیے کئی ایک سرکاری اور نیم سرکاری ادارے قائم ہوئے جنہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو موڑ توڑ کر اشتراکیت کے سانچوں میں ڈھالنے کی بے حد کوشش کی۔ لیکن چونکہ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی نوعیت اتنی واضح اور ہمہ گیر تھی کہ کسی طرح بھی ان کے درمیان مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے مسلمان جلد ہی ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔ بعض چیزوں کو تو انہوں نے شدید مجبوری کے تحت قبول کر لیا لیکن اُن کی معاشرتی زندگی کے بعض ایسے نازک معاملات بھی تھے جن میں وہ اشتراکیت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتے تھے، کیونکہ ان کی جڑیں ان کے احساسات میں پیوست تھیں۔ اس لیے وہ اس بات پر مُصر تھے کہ وہ انہیں جوں کا توں قائم رکھیں گے۔ یہ صورتِ حال اشتراکیت کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ انہیں زبردستی تبدیل کرنے کی طرف پوری توجہ دی جانے لگی اور جن لوگوں نے بھی مزاحمت کی ان کا قوت سے خاتمہ کر دیا گیا۔

دنیا کا ہر انقلاب دو سہاروں پر آتا ہے۔ تعلیمات اور صاحبِ تعلیمات۔ مجرّد تعلیمات سے ممکن ہے لوگوں کے افکار و تصورات میں کچھ تبدیلی آ جائے لیکن عالمِ واقعات میں تغیّر کے لیے یہ بات اشد ضروری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ کوئی ایسی انقلاب انگیز شخصیت بھی سامنے آئے جو عوام کی محبت اور عقیدت کی محور ہو اور جس کے سحر کے زیر اثر وہ ہر قسم کی قربانیاں کرنے پر تیار ہو جائیں ۔ اسی وجہ سے دنیا میں جو بھی انقلابی تحریک اٹھتی ہے وہ جہاں نئے نئے نظریات کا پرچار کرتی ہے وہاں ایک شخصیت کو بھی اُبھار کر سامنے لاتی ہے تاکہ عوام ان افکار کو قبول کرنے کے ساتھ ہی اُس شخصیت کی قیادت میں اس انقلاب کے لیے عملی جدوجہد شروع کریں ۔ اس شخصیت کی حیثیت ایک عام رہنما یا قائد کی نہیں ہوتی بلکہ انقلابی تعلیمات کے شارح اور ترجمان کی سی ہوتی ہے اور اس کی ذات ہی اس تحریک کو سب سے زیادہ قوت فراہم کرتی ہے ۔

اسلام میں یہ مقام صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے ۔ اُن کی مقدس ذات ہی مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا اصل مرکز و محور ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں حضورؐ کی محبت کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور امت کے دوسرے صلحا اور آئمہ کی محبت بھی جاگزیں ہے ، لیکن ان کی محبت کی اصل وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ یہ حضرات اُن کی محبت کے اصل مرکز سے ایک خاص نسبت رکھتے ہیں ۔ اور یہ حضورؐ کے جاں نثار فدائی اور آپ کی تربیت کے بہترین نمونے ہیں ۔ اشتراکیت نے خاص طور پر چین میں ماؤ کی ذات کو اسی طرح عقیدت کا مرکز بنایا ہے جس طرح اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو عقیدت ہے ، اور ماؤ کے کلام کو وہی مقام دیا ہے جو اسلام میں کلام اللہ کا مقام ہے ۔ اس کا ہر قول تنقید سے بالا ہے ۔ اس کا ہر فعل خطا سے پاک اور قابلِ تقلید ہے ۔ اُس کی ذات اشتراکیت کا ایک بلند ترین نمونہ ہے ۔ بچہ بچہ اس کے ملفوظات کی تلاوت کرتا پھر رہا ہے ۔ اس کی کتاب ہر معاملہ میں سرچشمۂ ہدایت قرار دی جا رہی ہے ۔ اس کی تصویر جگہ جگہ اس شان سے آویزاں کی جا رہی ہے کہ مشرکین نے شاید اپنے معبودوں کی تصویریں بھی اس کثرت سے کبھی نہ لگائی ہوں گی ۔ آپ چین کا کوئی رسالہ ، اخبار یا کتاب اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ ماؤ کی عظمت اور برتری کا نقش عوام کے دل و دماغ پر نہایت گہرے طور پر ثبت کیا جا رہا ہے ۔ اور انہیں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ یہ وہ عظیم ہستی ہے جو تمہاری فلاح و کامرانی کی واحد ضامن ہے ۔ جس کی غیر مشروط اطاعت ہی میں تمہاری کامیابی کا راز مضمر ہے ۔ یہ ہستی جو کچھ کہتی اور جو کرتی ہے وہ ہی اشتراکی چین بلکہ ساری دنیا کے لیے صحیح اور برحق ہے اور جو کچھ اس کے فرمودات یا اعمال کے خلاف ہے وہ سراسر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باطل ہے۔

ممکن ہے چین کی دوسری اقوام کے لیے ماؤ کی ذات کو اس حیثیت سے قبول کرنا کوئی اتنا کڑا اور شدید امتحان نہ ہو جتنا کہ مسلمانوں کے لیے ہے۔ ان کے لیے مرکزِ عقیدت کی یہ تبدیلی کفر ہے جسے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ اُن کے عقیدے میں قرآن مجید کے فیصلے ہی سو فیصد صحیح اور برحق ہیں اور حضور سرورِ دو عالم کے ارشادات و اعمال ہی حق و باطل کے درمیان تمیز کا آخری اور قطعی معیار ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انہیں ماؤ کی ذات کا پرستار بنانا اور انہیں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ حق و باطل کے فیصلے کے لیے ماؤ کی طرف رجوع کریں ایک ایسا اقدام ہے جو اُن کی روحانی موت کے مترادف ہے۔ آغاز میں تو مسلمانوں نے اسے محسوس نہ کیا اور اشتراکیت کو بیرونی استعمار اور گھر کی سرمایہ داری و جاگیرداری سے نجات کی ایک وقتی تدبیر سمجھ کر اس کا ساتھ دیا۔ لیکن اب جبکہ ماؤ کے خیالات اور اس کی ذات کو پوری طرح لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کیا جارہا ہے اور وہ اس بات پر مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ انہیں اگر اشتراکی چین میں رہنا ہے تو ماؤ کے پرستار اور مومن بن کر رہیں، ان حالات میں دنیا انہیں تنگ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ماحول نے انہیں اتنا بے بس کر دیا ہے کہ اُن کے لیے نجات کی اب کوئی راہ بھی باقی نہیں رہی۔

اشتراکیت اور تشدّد دونوں لازم ملزوم ہیں۔ دنیا کا جو گروہ بھی کسی غیر فطری نظام کو عوام پر مسلط کرنے کا عزم لے کر اٹھے گا وہ لازمی طور پر تشدّد سے کام لے گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ کبھی انقلاب کا یہ معقول راستہ اختیار نہیں کر سکتا کہ لوگوں کو پہلے فکری اعتبار سے اپنا ہمنوا بنائے اور پھر اکثریت کے بل بوتے پر نظام حیات میں تبدیلی لائے۔ غیر فطری نظام ہمیشہ جبر کے سہارے آگے بڑھتا اور انقلابات لاتا ہے۔ اس کے افکار کو سب سے پہلے بڑے ہی مصنوعی طریقوں سے عوام میں پھیلایا جاتا ہے۔ پھر بڑے عجیب و غریب ہتھکنڈوں کے ذریعے انقلاب کے قائد کو عظیم شخصیت بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اُس کے

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

© rasailojaraid.com